eISSN: 2073-3674
pISSN: 1991-7813

جاوید انور کی نظم: فکری وفنی ابعاد

Javed Anwar's Poem: Intellectual and Technical Dimensions

."

ڈاکٹر فرح عابد، اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ اسلامیہ کالج برائے خواتین، عید گاہ روڈ، فیصل آباد

ڈاکٹر سعدیہ طاہر، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، وفاقی اردو یونیورسٹی، اسلام آباد

Dr Farah abid ,Assistant professor,Govt Islamia graduate college for women eid gah road Faisal Abad
farahabid@gicwf.edu.pk
Dr. Sadia Tahir Assistant Professor dept. of Urdu, Federal Urdu University Islamabad

ABSTRACT

Javed Anwar is one of those poets who established his own identity under the influence of modern poetry and made poetry the basis of life. The structural effects of Western poetry can be clearly felt on Javed Anwar's poem. Some of his poems are written in the form of cantos. In his poems, the loneliness of the individual, the meaninglessness of life, social exploitation and the unemployment of the individual are expressed. In the first collection, the scope of social oppression revolving around the individual reaches to the British and American brutality until the last collection, but all these elements do not cause despair in his poems, but until the end, hope and a positive point of view are grasped by the reader. The atmosphere of Javed Anwar's poems is formed by urban life and its accessories. Cities have always been remembered as symbols of enlightenment, progress and courage, but in modern times, the life of cities has changed completely.

KEY WORDS: Javed Anwar, Modern Poetry, Urban Life, Enlightenment

جدید اُردو نظم کے معاصر منظر نامے پر شعراء کی جو کھیپ نظر آتی ہے وہ نظریاتی اعتبار سے سیاسی یا ادبی گروہ کا حصہ ہیں نہ ہی کوئی مخصوص فکری ڈسکورس ان کی شناخت میں اپنا کردار ادا کرتا نظر آتا ہے۔ جاوید انور کا شمار بھی انہی شعراء میں کیا جاتا ہے جنہوں نے جدید شعریات کے زیرِ اثر اپنی الگ شناخت قائم کی اور نظم کو زندگی کی اساس بنایا۔

اپنی کتاب ”اشکوں میں دھنک“ میں خود فرماتے ہیں:

"میں زندگی کو نظم کرنے کا قائل ہوں
زندگی جس میں موت بھی ہے، زندگی، جو
ایک ڈرامائی آہنگ ہے۔ ڈرامائی آہنگ جو
آپ کو کارخانہ حیات کے ہر نظام میں نظر
آئے گا۔"(۱)

جاوید انور کی نظم پر مغربی نظم کے ساختیاتی اثرات واضح طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں ان کی کچھ نظمیں کینٹوز کی فارم میں لکھی گئیں ہیں۔ ان کی نظموں میں فرد کی تنہائی، زندگی کی بے معنویت، سماجی استحصال اور فرد کی بے چارگی کا اظہار ملتا ہے۔ پہلے مجموعے میں فرد کے گرد گھومنے والے سماجی جبر کا دائرہ کار آخری مجموعے تک آتے آتے برطانوی اور امریکی بربریت تک جا پہنچتا ہے لیکن یہ تمام عناصر ان کی نظموں میں مایوسی کا باعث نہیں بنتے بلکہ آخر تک اُمید اور مثبت نقطۂ نظر پڑھنے والے کو گرفت میں رکھتا ہے۔ وطن اور بیرونِ وطن کے تجربات ان کی شاعری میں اس طرح رچ بس گئے ہیں کہ ان کی ذاتی روداد معلوم ہوتے ہیں۔ جاوید انور کی نظموں میں جو چیز سب سے زیادہ متوجہ کرتی ہے وہ احساس زیاں ہے۔ اکیسویں صدی کا انسان زندگی کی دوڑ میں جس طرح مگن ہے تفکر انگیز ہے۔ انسان فقط خسارے میں ہے کیونکہ وہ مشینی زندگی میں کھو کر اپنے حقوق و فرائض سے غافل ہو چکا ہے:

قسم ہے ڈوبتے دن کی
خسارہ ہی خسارہ ہے
ترے جوڑے کی کلیاں پاؤں کی
مٹی
مرا کالر دھویں کا استعارہ ہے!
تنی گردن
کسا سینہ
کسی جھلسی ہوئی ٹہنی کی صورت
گھر کو لوٹے ہیں

تو لگتا ہے
کہ ہم نے دن نہیں جیسے ہمیں
دن نے گزارا ہے (۲)

جاوید انور کی فکری اپچ اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ وہ سماجی جبر کے شکار انسانوں کو دیکھ کر جھنجھلا جاتے ہیں اور انہیں جھنجوڑ جھنجھوڑ کر اٹھاتے ہیں کہ غفلت کی نیند سے بیدار ہو کر غلامی کی زنجیروں کو اُتار پھینکو جب وہ مجبور اور بے بس انسان کو دیکھتے ہیں تو سوال کرتے ہیں کہ تم نے چپ کیوں سادھ رکھی ہے؟ ظلم کے خلاف آواز کیوں نہیں اُٹھاتے؟اُن کی نظر میں انسان ''طفل معصوم''ہیں جو اپنے حق کے لیے آواز نہیں اُٹھا سکتے:

تو نے کیوں اپنے گالوں پہ
سرسوں ملی
تو نے کیوں اپنی آنکھوں میں چونا
بھرا
تیری گویائی کسی دشت کے
بھیڑیے لے گئے
بولتا کیوں نہیں
بولتا کیوں نہیں ، طفل معصوم تو
کب سے بیمار ہے
کیسا آزار ہے جس نے تیری
شبوں سے تری نیند، تیرے
دنوں سے
کھلونے چرائے
تو سویا نہیں مگر جاگتا کیوں نہیں!
(۳)

انسان علم و دانش میں کاملیت کا متمنی ہے لیکن اس کو اپنی عملی زندگی پر لاگو کرنے کی بجائے صرف حصولِ رزق کا وسیلہ سمجھتا ہے۔ علم بغیر عمل صفر ہو جاتا ہے۔ یہ آسان سا کلیہ وہ سمجھنے سے قاصر نظر آتا ہے۔ جاوید انور ایسے ہی انسانوں کو موضوع نظم بناتے ہیں کہ انسان انسانیت کی معراج تک کیسے پہنچ سکتا ہے۔ انسان کو تاریکیوں سے کیسے نکالا جائے علم و تشدد کے خاتمے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جائیں کہ علم وادب انسان کی حقیقی زندگی میں شامل حال ہو جائے۔ ایسا علم جو بزدلی کی بجائے جرأت گفتار اور جرأت کردار کا سبب بنے ان کے بنیادی سوالات ہیں:

سب نے دیکھا کہ ماں کے سر کی
ردا
بیٹیوں کا لباس، باپ کا دل
ریشہ ریشہ ہوئے سر محفل
سب نے دیکھا، سبھی خاموش
رہے
اے ستاروں سے دیکھتی دنیا
اے کتابوں سے جھانکتی دانش
شعر سچا بھی ہو تو جھوٹا ہے
کربلا سے امام باڑے تک
پیاس آتی نہیں شہیدوں کی
بس انیس و دبیر آتے ہیں
شعر پڑھتے ہیں داد پاتے ہیں (۴)

جاوید انور کی نظموں کا ماحول شہری زندگی اور وہاں کے لوازمات سے تشکیل پاتا ہے۔ شہر ہمیشہ سے روشن خیالی، ترقی پسندی اور حوصلہ مندی کی علامت کے طور پر یاد کیے جاتے ہیں لیکن عہدِ حاضر میں شہروں کی زندگی یکسر تبدیل ہو کر رہ گئی ہے ذہنی اذیت، تھکن اور اضافی مشقت نے شہریوں کی زندگی کو فقط اذیت میں تبدیل کر دیا ہے۔ جاوید انور ملوں کی چمنیوں، گندگی کے ڈھیروں اور گریس بہتے ہوئے انسانوں کی

زندگی کا المیہ بیان کرتے ہیں اپنی نظم ''چھبیسویں سالگرہ'' میں صنعتی اور شہری زندگی کا منظر پیش کرتے ہیں:

مگر اے موت
ہاں اے موت ہم تجھ سے نہیں
ڈرتے
ہمارا خون ملوں کی چمنیوں پر اپنے
اصلی رنگ میں لکھا ہوا ہے
دیکھ ہم تو مشین میں گریس کی
مانند بہتے ہیں
تجھے ہم پاؤں کی ٹھوکر پہ لکھتے ہیں
ہمیں تو زندگی سے خوف آتا
ہے(۵)

اسی موضوع پر لکھی گئی نظم ''ضمیر کو لوری'' میں بھی شہری زندگی کے بے حس ماحول کی عکاسی کی گئی ہے جہاں سوگ اور گالیوں کی کیفیت بھی نظر نہیں آتی کیوں کہ محبت اور نفرت، خوشی اور غم حساس انسانوں کی نشانیاں ہیں جبکہ مجموعی اعتبار سے ہمارا معاشرہ بے حسی کی لپیٹ میں آ چکا ہے۔ اس بے حسی سے کوئی بھی محفوظ نہیں رہ سکا:

گھڑں کے آس پاس بھی، گھروں
میں بھی
نہ سایے ہیں، نہ دھوپ ہے
نہ سوگ ہے، نہ گالیاں
بس ایک بے حسی ہے جس کی شہر
کے
آخری مکاں تک رسائی ہے(۶)

جاوید انور سماج میں مظلومیت کا شکار مجبور اور بے بس انسانوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے انہیں ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ایسے معاشرے میں جہاں غریب غریب تر ہوتا جا رہا ہے اور امیر طبقہ بھی انتہاؤں کو چھو رہا ہے غربت بغاوت کی سرحدوں تک لے جاتی ہے۔ جاوید انور بغاوت آمادہ والدین کی جذباتی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

میری ہنڈیا جلی
میرا چولہا بجھا
میری جھولی سے حرفِ دُعا گر گیا
میرے بچے تو لب کھولتا کیوں
نہیں
بولتا کیوں نہیں!(۷)

بے حسی فرد کی ذات سے بلند ہو کر اجتماعی طور پر پوری دنیا کا احاطہ کر چکی ہے۔ جاوید انور جہاں اپنے وطن میں بڑھتی ہوئے بے حسی اور خود غرضی کا تذکرہ کرتے ہیں وہیں بیرونِ ممالک میں بے حسی کو چھوتا ہوا معاشرہ بھی اُن کے قلم سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ قابل و بغداد سے، فلسطین و عراق تک ظلم و بربریت کی داستانیں بکھری ہوئی ہیں۔ نظم ''دھند میں لپٹی ہوئی دُعا'' میں شاعر سامراجی عالمی طاقتوں کو علامت کے طور پر بھیڑیا کہہ کر مخاطب کرتا ہے امریکی اور اسرائیلی جارحیت کا واضح اظہار اس نظم میں بھیڑے کی علامت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ شاعر دُعا کرتا ہے کہ بے حسی کی منجمد جھیلوں میں آگ کی بارش برسا کر یہ نفرت و غصے کے شعلے بجھ سکیں:

اے خدا
بے حسی کی منجمد جھیلوں کو آتش
بار کر
میرے دل سے کابل و بغداد تک
دھند ہے
دھند ہے اور رات ہے

بھیڑئے سوئے نہیں (۸)

"بھیڑیے سوئے نہیں" میں سماجی جبر اور معاشرتی استحصال کا اظہار باقی مجموعوں کی نسبت زیادہ شدت سے نظر آتا ہے وہ اس مجموعے میں عالمی استعماری قوتوں کے خلاف کھل کر اپنے غصے اور نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ عالمی اور بین الاقوامی دہشت گردی میں جس طرح مسلمانوں کو ہدف تنقید بنایا جارہا ہے وہ افسوس ناک ہے خاص طور پر ۹/۱۱ کے بعد مسلمانوں پر جس طرح زندگی تنگ کی گئی قابل مذمت ہے۔ شاعر درج بالا نظم میں دُعامانگ ہے۔ دھند میں لپٹی ہوئی دعا میں شاعر کہتا ہے کہ اے خدا یہ بھیڑیے سوجائیں تاکہ خلقِ خدا ان کے شر سے محفوظ رہ سکے۔ اس نظم سے شاعر کی حساسیت واضح ہوتی ہے۔ "بھیڑیے سوئے نہیں" کی ابتدائی نظمیں نثر/ پیراگراف کی شکل میں لکھی ہوئی ہیں۔ امجد طفیل لکھتے ہیں:

"اس نوع کی ساخت اس بات کا تقاضا کرتی
ہے کہ نظم کو ایک سانس میں پڑھا جائے
کیونکہ نظم آزاد میں مصرعے کا تعین خیال
کرتا ہے جہاں خیال کی ایک اکائی مکمل ہوتی
ہے۔ وہیں مصرعے کی تکمیل ہوتی ہے۔ ان
نظموں میں بہاؤ کی ایک کیفیت ہے۔ خیال
کی لہر تیز ہے اور شاعر اپنے تخلیقی تجربے کو
بے کم کاست بیاں کرتا چلا جاتا ہے۔"(۹)

نظم "اسے آزردگی لاحق ہے" بھی پیراگراف کی شکل میں لکھی گئی ہے اس نظم میں ایک ایسے فرد کی داستانِ حیات ہے جو رزق کمانے کے لیے مغرب کا سفر کرتا ہے۔ ساری زندگی محنت کرنے کے بعد اب وہ عمر کے آخری حصے میں بیمار ہے اور آزردہ بھی ہے لیکن کوئی اس کا پیارا اس کا سہارا موجود نہیںٰ ہے۔ وہ تنہا اپنی بیماری سے لڑ رہا ہے۔ زندگی اُس کے لیے بوجھ بن گئی ہے۔ نظم کے چند مصرعے قابلِ غور ہیں:

"اسے پژمردگی کا عارضہ ہے اور کمر میں درد
رہتا ہے دواؤں کی بھی حد ہوتی ہے

دروازے ہمیشہ بالکونی کی طرف ہی تو نہیں
کھلتے کہ پھندے بھی تو آزادی کا رستہ ہیں ،
بھنور شریان میں ہوں تو پلوں سے کودنے کی
کیا ضرورت ہے، مگر وہ سوچتا رہتا ہے لیکن
سوچتا کم ہے کہ اس کو اپنی نامردی پہ ملک
الموت سے بڑھ کر یقین ہے، کانپتا رہتا ہے
دن بھر، رات بھر نیندوں کی پہرے داری
کرتا ہے نہ اس کو خواب آتے ہیں نہ اس کی
آنکھوں کو سورج، ستارے، پھول اور تتلی
سے کوئی واسطہ ہے، جانتا ہے وہ اسے
آزردگی لاحق ہے، ہنسنا چاہتا ہے، سوچتا ہے
کیوں ہنسوں، میں ہنس پڑا تو زندگی ہنسنے لگے
گی۔۔۔"(۱۰)

اس مجموعے میں بیشتر ایسی نظمیں ہیں جن میں مابعد جدید عہد میں سانس لیتے انسانوں کو نئے حسی تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ ان نظموں میں "امریکہ میں رات کے آٹھ بجے ہیں"، "روبوٹوں کی اس دنیا میں"، "سلطان علی کا المیہ"، "دھند میں لپٹی ہوئی دُعا" اور "ایک عام آدمی کی موت پر" شامل ہیں گو کہ ان کا طرزِ اظہار ست رو اور سادہ ہے تاہم ان نظموں میں خالص پن اور خلوصِ نیت شامل ہے۔ شاعر ان نظموں میں اُن فلاحی اداروں اور این جی اور کا بھی ذکر کرتا ہے جو لاکھوں ڈالر لوگوں کی فلاح کے لیے حاصل کرتے ہیں مگر وہ صرف تشہیری مہموں اور درپردہ کالے کرتوتوں پر خرچ کرتے ہیں۔ شاعر عالمی صارفی معاشرے اور استعماری قوتوں کا احتساب چاہتا ہے۔ نظم "سوتا جاگتا خواب" میں لکھتے ہیں:

تو جو خود کو دنیا بھر کے
دستر خوانوں کا مہمان سمجھتا ہے
جو

ننھے منے بچوں کے پیٹوں سے لٹکتی
انتریاں دیکھ
کے ہنستا ہے اور کہتا اور سمجھتا ہے
یہ دنیا تیری
ہے، تجھے
ماریں!
ہم سب، ہم جو بے ہتھیار ہیں ،
جن کی گندم، جن کا پانی، جن
کا تیل اور جن کا سونا، جن کا خون
پسینہ تیرے
خس خانوں میں گرتا ہے تو تجھ
کو ٹھنڈک ملتی
ہے تجھے
ماریں!
تجھے ماریں
دل کہتا ہے
مل جل کے
تجھے ماریں!
اور ماریں گے تجھے تیرے اپنے
ہتھیاروں سے، تیرے جہازوں ،
تیرے
بموں ، تیری بندوقوں ، تیرے
ریڈیو، ٹی وی اور
اخباروں
سے تجھے ماریں گے

تجھے ماریں گے وہ ننھے منے لوگ
جنہیں تو جانوروں سے گھٹیا
سمجھتا ہے، تو جن کی روٹی چھین
کے ان پر بم
برساتا ہے اور مرے ہوئے
لوگوں کی خاطر پانی اور
دوائیاں لے کر آتا ہے تو ٹی وی
دیکھتی خلقت تجھ
کو سخی سمجھتی ہے
تجھے ماریں گے (۱۱)

جاوید انور نے اس نظم میں پوری صدی کا المیہ چند مصرعوں میں بیان کر دیا ہے۔ ایسی صورت میں جب ہر طرف جنگ کے خطرات منڈلا رہے ہیں جاوید انور جیسا امن پسند شاعر بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا وہ دیگر شاعروں سے بھی امید رکھتے ہیں کہ وہ اپنی قیمتی جانوں کو جنگ کی نظر نہ ہونے دیں بلکہ وہ ان شاعروں کو مشورہ دیتے ہیں کہ جنگ کی صورت میں اپنی جان بچاؤ اور شاعری سے گریز کرو کیونکہ شاعری تو فنونِ لطیفہ میں شمار ہوتی ہے جو صحت مند معاشرے میں ہی پنپ سکتی ہے:

جنگ بڑی شدت سے جاری
ہے، تم
زندہ رہنا
لڑنا چاہتے ہو تو
باہر نکلو
دوڑو
ورنہ اپنی نظم سمیت اس ڈست
بن میں گھس جاؤ! (۱۲)

مشینی دور کا انسان روبوٹ کی مانند فطرت سے کنارہ کش ہو چکا ہے ڈالر کمانے کی لگن نے اُسے زندگی کی حقیقی خوشیوں سے محروم کر دیا ہے۔ مغربی تہذیب کے زیرِ اثر اس وقت ہمارے معاشرے میں بھی خاندانی نظام تباہی کے دہانے پر پہنچ چکا ہے۔ شاعر نئے دور کے انسان کی محرومیوں کو نظم ''روبوٹوں کی اس دنیا میں'' بہت خوبصورت انداز میں سامنے لے کر آتا ہے ہم ایسے دور میں جی رہے ہیں جب انسانوں کی بجائے لان، درخت اور پرندے ہمارے رفیق بن چکے ہیں۔ شاعر شکر ادا کرتا ہے کہ اُسے انہی کی رفاقت میسر ہے ورنہ دنیا تو نہ ہونے برابر ہے:

تارکول کے صحرا میں
پگھلے لوہے جیسا دن
تانبے کے انسان!
یہ ڈالر کی دھوپ ہے اس کی تپش
جہنم جیسی ہے!
''دیر سے آئے ہو''
جی بیوی کو بخار ہے، بچے روتے
تھے
بسوں کی ہڑتال ہے، پیدل
آیا ہوں
آیا رکھ لو، موٹر سائیکل لے لو،
کام تو کام ہے بھئی
ہڑتایں وڑتالیں تو ہوتی ہی رہتی
ہیں
لیکن تم
کل بھی دیر سے آئے تو تنخواہ
رک جائے گی
بچے روتے ہیں:

ممی، ممی!
ممی ممی۔۔۔ سارا دن ممی ممی
مجھ کو اور ضروری کام بھی اس دنیا
میں
(بیوٹی پارلر، فٹ نس کلب اور
وغیرہ وغیرہ)
شوفر یہ لو ایک ہزار کا نوٹ ہے
ان کو میک ڈونلڈ میں لے جاؤ
برگرور گر لے دنیا
میں آج بھی دیر سے آؤں گی
یہ ڈالر کی دھوپ ہے اس کی تپش
جہنم جیسی ہے
جن کے پاس بہت ہے وہ بھی،
جن کے پاس نہیں ہے وہ بھی
اس کی آگ کا ایندھن ہیں
مولا تیرا شکر ہے روبوٹوں کی اس
دنیا میں، ضربوں، تقسیموں کے
اس دوزخ میں، یہ چھوٹا سا لان،
یہ تین درخت اور پانچ
پرندے میرے ہیں
یہ جنت میری ہے۔۔۔(۱۳)

ڈالر کماتا فرد جو مسائل کے انبار میں گھرا ہوا ہے اُس کی بیوی جسے فضولیات سے فراغت نہیں ہے اور نظر انداز ہوتی ہوئی نسل ہمارا معاشرتی المیہ ہے۔ یہ ممی ڈیڈی قسم کے بچے جو برگر کے دور کی پیداوار ہیں کیسے ملکی ترقی میں اپنا کردار ادا کر پائیں گے جاوید انور معاشرتی تنہائی اور فرد کی تنہائی کو عالمی پس منظر میں دیکھتے ہیں۔

نظم "ریشم جیسی گود کی خواہش" میں تین نسلوں کا نوحہ لکھتے ہیں جو دراصل ان کی اپنی ذاتی روداد معلوم ہوتی ہے۔ باپ نظم میں آنے والا پہلا کردار جو بچوں کی خوشیاں پوری کرنے کے خواب آنکھوں میں سجا کر گھر سے نکلا تھا لیکن مہینے بھر کی کمائی جیب کترے لے اُڑے لیکن اس کے خوابوں کا پودا ابھی تک ہرا بھرا تھا۔ دادا، جس کے کاندھے اور کمر دابتے اپنے باپ کا بچپن اُن کی آنکھوں میں دیکھا کرتا تھا۔ ماں جس سے محرومی، رشتہ قائم ہو۔ ماں کے کردار کو جس محرومی بھرے الفاظ میں پیش کیا لائق تعریف ہے:

دن۔۔۔
جیسے بھی ہوں گزر ہی جاتے ہیں
لیکن پہلی کتاب کا پہلا صفحہ کھلنے
سے بھی پہلے
ماں کا گزر جانا۔۔۔
عمر گزر جاتی ہے لیکن
ریشم جیسی گود کی خواہش
اک مکڑی کا جالا بن کر زندہ رہتی
ہے
ایسا سرہانہ جس میں بھاری سر کا
بوجھ سما جائے
کہیں نہیں ملتا
کبھی نہیں ملتا(۱۴)

اس نظم میں بیمار معاشرے کے مجموعی رویوں کی تصویر کشی کی گئی ہے، معاشرے، جہاں چور اُچکے جعلی مہریں لگانے والوں کی اجارہ داری ہے جہاں مسجد کو جائے امان کی بجائے دھندہ کرنے والوں کی پناہ گاہ کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ واحد متکلم کردار اپنے بھائی کا ذکر کرتا ہے جو معاشرے کی چالاکیوں سے بے خبر بچوں کے کپڑوں او رفیسوں میں دبا ہوا زندگی گزار رہا تھا اے جی آفس میں اُس کی سادہ لوحی کا فائدہ اُٹھاتے

ہوئے کس چالاکی سے اُس سے دستخط کرائے گئے جس کے کفارے کے طور پر اُس کی گیارہ سال پنشن رُکی رہی ہمارے دیمک زدہ بیمار معاشرے کی گھر گھر کی کہانی ہے۔ نظم کے آخری حصے میں منافقت بھرے معاشرتی رویوں کو بے نقاب کیا گیا ہے:

''ڈاکٹر جاوید انور کا بھائی، سب انجینئر انور علی
کا بیٹا شہزاد انور کل چونتیس سال کی عمر میں
دم توڑ گیا۔۔۔ ان للہ وانا۔۔۔ اس کی پچھلے
سال سے رُکی ہوئی تنخواہیں اس کے لواحقین
کو مل جائیں گی (محکمہ کے حکامِ اعلیٰ) وہ اک
بہت ہی رحمدل، ایماندار افسر تھے۔ ان کی
سخاوت بھول نہیں سکتے ہم۔۔۔ اس کے
ماتحتوں کا کہنا ہے۔''(۱۵)

جاوید انور نے کرداری نظمیں بھی تخلیق کی ہیں جو معاشرے کے پسے ہوئے طبقات کی نمائندگی کرتی ہیں ان نظموں میں سب سے بھرپور کردار سلطان علی کا ہے۔ رزق کی تلاش میں دیس پردیس کی سیر کرنے والوں کو بڑے شہروں میں جا کر جس طرح اپنی ذات کی نفی کرنا پڑتی ہے اور جس طرح وہ اپنی شناخت گم کر بیٹھتے ہیں معاشرتی آشوب کی صورت اس نظم میں دکھایا گیا ہے۔ نظم کا مرکزی کردار پنڈ دادن خان سے لاہور اور وہاں سے امریکہ پہنچ کر معاشی اعتبار سے تو ترقی کرتا ہے مگر اپنی شناخت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ وہ بیگانگی کے کرب میں زندگی گزار رہا ہے۔

واشنگٹن کے مے خانوں میں
سلطان علی کے کانوں میں
پنڈ دادن خان کے مچھر اب
دن رات گٹار بجاتے ہیں
پنڈ دادن خان کی گلیوں میں
سلطان علی
کو جاننے والا کوئی نہیں (۱۶)

نظم ''ابوعبیدہ'' میں ابوعبیدہ کا کردار منافقت سے بھرپور جاہل اور پسماندہ معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔ ابوعبیدہ کے در پردہ شاعر اُن حضرات کو ہدف تنقید بناتا ہے جو مذہبی ٹھیکے دار بنے رہتے ہیں۔ بڑی بڑی بڑھکیں مارتے ہیں لیکن اپنے گھروں میں اہلِ خانہ کے مسائل کا ادراک نہیں رکھتے۔ طارق ہاشمی لکھتے ہیں کہ:

> ''فکر کو قید کرنے والے مذہبی پیشوا خود ذہنی طور پر کتنے پسماندہ اور سماجی مسائل سے کس حد تک نابلد ہیں، اس کا اظہار جاوید انور کے کردار ''ابوعبیدہ'' سے بخوبی ہوتا ہے جس کے نزدیک مذہب چند رسوم سے آگے کچھ نہیں ہے یہ کردار ایک ایسے طبقے سے تعلق رکھتا ہے جو چند نیکیوں کے حصول اور چند برائیوں سے گریز کو حصولِ جنت کا وسیلہ سمجھ کر کچھ عبادات میں مشغول رہتا ہے مگر درونِ سماج حتیٰ کہ درونِ خانہ بھی بعض مسائل کا ادراک نہیں رکھتا۔''(۱۷)

یہ نظم پیری مریدی کے قبیح دھندے کا پردہ چاک کرتی ہے وہ پیر و مرشد جو ایک زمانے کے لیے نجات دہندہ کی صورت رکھتا ہے اپنے ہی گھر والوں کے لیے باعثِ اذیت بن جاتا ہے۔ دوسروں کے مسائل سلجھانے والے کو اپنے گھر کی خبر سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

ابوعبیدہ۔۔۔
ابوعبیدہ ذرا ٹھہرنا
پسِ دریچہ برہنہ پا وبدن دریدہ
کھڑی ہے بنتِ ابوعبیدہ
نہ گھر میں گندم نہ خشک انجیر اور
نہ خرما

گداو گرما گلی میں دوزخ منارہے

ہیں

فرشتے چابک چلارہے ہیں

کہ سیر جنت کو جا رہے ہیں ابو

عبیدہ(۱۸)

جاوید انور اپنی نظموں میں نئی نئی تمثالیں لے کر آتے ہیں وہ اپنی نظموں میں جو زبان استعمال کرتے ہیں اس میں سادگی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے۔ مسافر اور سفر ان کی نظموں کے بنیادے استعارے ہیں جو فرد کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو ظاہر کرتے ہیں۔ جاوید انور جب علامتیں کشید کرتے ہیں تو انہیں پوری مسلم امہ کے لیے وسیع تر تناظر میں استعمال کرتے ہیں۔ نظم ”انتباہ“ میں ابابلیں بطور علامت استعمال کی گئیں ہیں ۔ اس نظم سے ابابیلیں اور کعبے کا واقعہ ہمارے ذہن میں تازہ ہو جاتا ہے اس تلمیح کو علامتی انداز میں اس طرح برتا گیا ہے کہ آج کے منظر نامے پر پورا اُترتی محسوس ہوتی ہے۔ پوری نظم میں تلمیحات کا استعمال نہایت خوبصورتی سے کیا گیا ہے:

ابابیلیں ابھی زندہ ہیں ظالم

ہاتھیوں والو

وہ کعبے جو دلوں میں ہوں

ہتھوڑوں سے نہیں ڈھیتے

اگر موسیٰؑ نہ آئیں تو بھی اہراموں

سے وحشت ہی ٹپکتی ہے

ابابیلیں ابھی زندہ ہیں ظالم

ہاتھیوں والو

کہ نفرت وہ توانائی ہے جو ذرے

کو ایٹم بم بناتی ہے

ادھر دیکھو

پہاڑوں پر،

بیابانوں میں ، صحراؤں میں ، جو
بھی ہے
(محبت بھی)
سبھی نفرت سے تم پر تھوکتے ہیں
(لڑ نہیں سکتے)(۱۹)

اس نظم میں ظالم ہاتھیوں والوں کو بطور علامت استعماری اور سامراجی طاقتوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے جنھوں نے پوری دنیا کے مسلمانوں کو اُن کے حقوق سے محروم کر رکھا ہے۔ مسلم امہ پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے ہیں اور اُن کے حقوق غصب کیے گئے ہیں اسی لیے شاعر کا خیال ہے کہ سبھی ان ہاتھیوں والوں پر نفرت سے تھوکتے ہیں اور نفرت اس دنیا کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ ان نظموں میں نفرت اور غصے کی جو زیریں لہر پڑھنے والے کو اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے اُس کا سب سے بڑا سبب سیاسی و سماجی جبر کے سامنے مجبور اور زیردست لوگوں کی بے بسی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کھل کر عالمی استعماری طاقتوں کے خلاف نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ اپنے حقوق سے بے بہرہ انسانوں کو غیرت دلاتے ہیں وہ نہ صرف اپنے بلکہ دوسروں کے حقوق کے لیے بھی آواز اٹھانے کا مشورہ دیتے ہیں:

بھونک،
اے خارش زدہ حیوان
بھونک!
بھونک ان کے واسطے جو بھونک
بھی سکتے نہیں!!(۲۰)

اس نظم میں جاوید انور حیوان کے پردے میں انسانوں سے مخاطب ہیں وہ انسان جو نچلے طبقے کے اُن افراد سے تعلق رکھتا ہے جن کو معاشرے میں جانوروں سے زیادہ حقوق نہیں دیے جاتے نہ ہی اُن کے حقوق کا تحفظ کیا جاتا ہے۔ وہ ایسے معاشرے کا حصہ ہیں جہاں چور ڈاکو معزز ہیں جبکہ غریب ایماندار حقیر اور پست۔

جاوید انور کا آخری مجموعہ کلام عہد حاضر کے انسان کی ذہنی ابتری، تنہائی، ناآسودگی اور حیوانی طرزِ عمل کی واضح تصویریں پیش کرتا ہے۔ ''بھیڑیا'' ایک وسیع تر علامت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ خود سے بیزار اور لاتعلقی کا شکار عہدِ حاضر کا فرد ان بھیڑیوں کے ہاتھوں لقمہ اجل بن جاتا ہے۔ ٹہنی ٹہنی بیٹھے ہوئے گدھ، بدن کی بوٹیاں نوچتے ہوئے بھیڑیے پل پل گھورتی ہوئی آنکھیں اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی خوف وہراس کی فضا ان کی نظم میں ذات سے نکل کر اجتماعی کرب کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔

شیزوفرینیا ایسی اعصابی بیماری ہے جس میں دماغ اور جسم کے دیگر حصوں میں رابطہ ٹوٹنے لگتا ہے۔ بعض اوقات دماغ دیگر اعضا کو غلط پیغام دینے لگتا ہے۔ شیزوفرینیا کے مریض کا ذہن ہر وقت کسی الجھن کا شکار رہتا ہے۔ چڑچڑاپن، تنہائی، گھبراہٹ اس مرض کی علامات ہیں۔ یہ مرض عموماً سولہ سے تیس سال کی عمر میں اپنا اثر دکھاتا ہے۔ اس مرض میں مبتلا افراد کسی موضوع پر بات کرتے ہوئے اچانک موضوع تبدیل کر دیتے ہیں۔ جاوید انور کی طویل نظم ''برزخ کے پھول عرف شیزوفرینیا'' کی مرکزی کردار میں یہ تمام علامات دیکھی جاسکتی ہیں۔ نظم میں شیزوفرینیا کے مرض میں مبتلا لڑکی درحقیقت ہمارے بیمار اور مفلوج سماج کی علامت کے طور پر سامنے آتی ہے۔ شاعر فلیش بیک کی تکنیک استعمال کرتے ہوئے مرکزی کردار کو ماضی کے جھروکوں تک لے جاتا ہے۔ عہد حاضر کے پُرآشوب ماحول اور فرد پر اس کے اثرات اس نظم کے مرکزی موضوعات ہیں۔ علم دین اور اُس کی کٹی ہوئی تین انگلیاں، خودکشی کرنے والا لڑکا، مادر زاد فرشتہ، سگِ گرسنہ، جنسی بلوغت کا پہلا احساس، لال آنکھوں والا بھیڑیا، جنسی لذتیت، بگ بینگ، اُسامہ بن لادن، کالا پتھر جیسے متنوع موضوعات عہد جدید کے انسان کی ذہنی ابتری کا منظر پیش کرتے ہیں:

گرم لہو کی خوشبو!
سترہ گولیاں نیند کی
اور بھیڑیا
لال لال آنکھیں ہیں اُس کی،

سرخ کوئلے جیسی،
دروازے میں کھڑا ہوا
تھا
جب میں
چیخی،
آج رات کو
ڈاکٹر صاحب،
نرسیں
مجھے چڑیلیں لگتی ہیں
اور آپ کے کندھوں
پر کبھی کبھی
کسی سور کا چہرہ ہوتا ہے[۲۱]

جاوید انور کی ابتدائی نظموں میں ذاتی واردات اور مقامی تہذیب و ثقافت کی جھلکیاں ملتی ہیں جبکہ بعد کی نظموں میں وہ فرد سے لے کر عالمی منظر نامے تک مختلف طاقتوں کے خلاف بر سرِ پیکار نظر آتے ہیں اور جہاں وہ اپنے عزائم میں ناکامی کا سامنا کرتے ہیں وہاں مایوسی اور نامرادی کے جذبات کے زیرِ اثر نہیں آتے بلکہ اُمید اور تبدیلی کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں یہی ان کی نظم نگاری کا مثبت زاویہ ہے۔

حوالہ جات

1. جاوید انور، فلیپ: اشکوں میں دھنک، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء
2. جاوید انور، بھیڑیے سوئے نہیں، لاہور: قوسین، ۲۰۰۹ء، ص:۱۱۹
3. جاوید انور، شہر میں شام، لاہور: پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈ، ۱۹۹۱ء، ص:۱۲
4. جاوید انور، بھیڑیے سوئے نہیں، ص:۶۳۔۶۴
5. جاوید انور، شہر میں شام، ص:۷۶۔۷۷
6. جاوید انور، بھیڑیے سوئے نہیں، ص:۴۸
7. جاوید انور، شہر میں شام، ص:۱۳
8. جاوید انور، بھیڑیے سوئے نہیں، ص:۴۷
9. امجد طفیل، جاوید انور کی نظمیں، مشمولہ: دستاویز ۱۵۔۱۴، ادارت: اشرف سلیم، حبیب چوہدری لاہور: دستاویز رائٹرز فورم، س ن، ص:۵۹
10. جاوید انور، بھیڑیے سوئے نہیں، ص:۲۴
11. ایضاً، ص:۶۰۔۶۱
12. جاوید انور، اشکوں میں دھنک، ص:۳۹
13. جاوید انور، بھیڑیے سوئے نہیں، ص:۷۵۔۷۶
14. ایضاً، ص:۷۸۔۷۹
15. ایضاً، ص:۸۳
16. ایضاً، ص:۷۰
17. طارق ہاشمی، جدید نظم کی تیسری جہت، ص:۱۹۱
18. جاوید انور، بھیڑیے سوئے نہیں، ص:۳۳
19. ایضاً، ص:۵۶
20. ایضاً، ص:۷۵
21. جاوید انور، برزخ پھول، لاہور: القا پبلشرز، ۲۰۱۶ء، ص:۵۵